باب2

بچپن اور ابتدائی تعلیم

میرے بچپن کے دن

مجھے والدین سے ننھیال تک کے سفر کے کچھ کچھ واقعات یاد ہیں۔ گو کہ اس وقت میری عمر محض 5 سال تھی۔ ان ہی دنوں میرے والدین مظفر آباد کی ایک نواحی بستی کائی منجہ میں اپنے بزرگوں کے گجر مریدوں کے ہاں مقیم تھے، جہاں سے مجھے میرے ماموں پیر غیاث الدین لے گئے۔ میری دادی جان کے بھائی سید فقیر حسین شاہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ان دنوں بارڈر بہت نرم ہوا کرتے تھے۔ دونوں طرف سے فوج کی اس قدر Deployment بھی نہیں تھی۔ نرمی ہونے کی وجہ سے لوگوں کا آر پار آنا جانا آسان تھا۔ تاہم انڈیا پاکستان کے درمیان 1949 میں جنگ بندی کے معاہدہ کے بعد سرحدوں کے نقشوں پر نشاندہی ہوگئی تھی۔ مقامی لوگوں کو دونوں اطرف سے اس کا ادراک تھا تاہم موقع پر فوجوں کی مورچہ بندی نہیں تھی جس وجہ سے آمدورفت عام تھی۔

کائی منجہ سے میری ننھیال کے گھر تک سفر کے دوران مجھے دن کے وقت کسی گاؤں کے ایک گھر میں رکھا گیا۔ میں بہت رو رہا تھا۔ ایک خاتون نے مجھے گود میں اٹھایا ہوا تھا جو ایک کوٹھے میں اپنی بھینسوں کو چارا بھی ڈال رہی تھی اور ساتھ ہی یہ کہے جا رہی تھی، ''اس ماؤ تا قہر آوئے جس اس سونڑے معصوم کو کروں کڈیا۔'' اس خاتون کا یہ جملہ آج بھی میری نفسیات میں پیوست ہے۔ میں نے ایک بار

اس کا تذکرہ اپنی والدہ سے کیا جنہوں نے کہا کہ آپ کو میری مرضی کے خلاف والد صاحب نے زبردستی اپنی زمینوں پر تسلط رکھنے کے لیے نانی کے پاس بھجوایا تھا۔

یہ بات مجھے صحیح بھی لگتی ہے کیوں کہ میرے والد صاحب کو زمینوں سے بہت دلچسپی تھی اور وہ ہم سب بھائیوں کو بھی ہمیشہ زمینیں خریدنے کا مشورہ دیتے اور اس کے فوائد بیان کرتے رہتے تھے۔ میرے والد صاحب کی زمین پٹوار حلقہ درنگلہ تحصیل کرناہ میں تھی جو میرے آزاد کشمیر ہجرت تک مقبوضہ کشمیر میں میرے نام الاٹ رہی اور اس کے محاصلات میری ننھیال والے کاشتکاروں سے لیتے رہے۔ ہمارے کاشتکار بہت ہی اچھے لوگ تھے جو پائی پائی کا حساب دینے کے علاوہ میرا بہت خیال رکھتے تھے اور میرے ساتھ بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی عورتیں مجھے اپنے بچوں کی طرح پوچھتیں اور کہا کرتی تھیں، ''یہ ہمارے پیروں کی نشانی ہیں۔'' اس کا مطلب میں یہ لیتا ہوں کہ میرے اجداد غالباً ان لوگوں کا بہت خیال رکھتے رہے ہیں۔ میں آزاد کشمیر سے جتنی بار بھی ویزے پر مقبوضہ کشمیر گیا ان لوگوں سے ملنے ان کے گھر گیا جہاں جا کر بہت سکون آتا ہے۔

ایک اور واقعہ جس کے میرے ذہن پر انمٹ نقوش یوں ہیں کہ مجھے اور میرے ماموں کو پولیس غیر قانونی طور بارڈر کراس کرنے کے جرم میں کنڈی ہمارے گھر سے پکڑ کر لے گئی۔ میرے ماموں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں جبکہ مجھے ایک شخص نے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ بہت سے لوگ ایک جلوس کی صورت میں جا رہے تھے۔ اس سے پہلے گھر پر جہاں میں مسلسل رو رہا تھا، مجھے میری نانی صاحبہ اور خالائیں تسلیاں دے کر بہلا رہی تھیں اور میرے ماموں مجھے یہ بات ذہن نشین کروا رہے تھے کہ ''مجھے ماموں پاکستان سے نہیں لایا بلکہ میں ''خود چھٹ کڑیاں'' سے بارڈر کراس کر کے آیا ہوں۔'' چھٹ کڑیاں تحصیل کرناہ میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان ایک منقسم گاؤں ہے جس کے دونوں اطراف ہمارے رشتہ دار رہتے ہیں۔ میری دادی جان کا تعلق بھی اس گاؤں سے تھا اور سید فقیر حسین شاہ جو مجھے ماموں کے ہمراہ لائے تھے، اسی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ میرے ماموں کی ایک قدرتی وضاحت لگتی ہے جس کا ادراک مجھے اس وقت ہوا

جب میں سن شعور میں اس گاؤں میں اپنی دادی کے بھائی کے گھر گیا۔ میرے ماموں کے بازو باندھے' آنکھوں پر پٹی اور مجھے کسی کے کندھے پر سوار ایک دفتر میں پہنچایا گیا جہاں ایک سا لباس پہنے ہوئے بہت سے لوگ تھے' جواب احساس ہو رہا ہے کہ پولیس کا عملہ تھا۔ اور دفتر کوئی عدالت تھی۔ وہاں کچھ کاغذ وغیرہ لکھے گئے ماموں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اور مجھے اٹھا کر گھر لے آئے۔ نہ معلوم کوئی کیس بنایا نہیں بنا، لیکن اس کے بعد نہ تو مجھے کسی اجنبی جگہ پر لے جایا گیا اور نہ ہی مجھ سے کسی نے کوئی پوچھ گچھ کی۔

اس مشق کے دوران سفید لباس میں ملبوس لنگی باندھے ہوئے ایک شخص نمایاں تھا جس کا بعد میں مجھے ادراک ہوا کہ وہ کنڈی گاؤں سے تعلق رکھنے والے مرحوم قاضی عبدالرحمان صاحب تھے جو ضلع مظفر آباد اور بارہ مولا کے جانے پہچانے سیاسی رہنما تھے۔ مجھے سال 1965 کی جنگ کا ان کا ایک واقعہ یاد آتا ہے جب فوج نے اس علاقہ میں سخت گیر اقدامات کے علاوہ شام سے سورج نکلنے تک کا کرفیو بھی نافذ کیا گیا تھا۔ اس دوران نماز فجر کے وقت نمازیوں کو دھر لیا جاتا اور شدید تشدد کیا جاتا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب پاکستان کی طرف سے آپریشن جبرالٹر (1965) کے نام سے مقبوضہ کشمیر میں ایک بے مقصد در اندازی کی گئی تھی۔ علاقے کے مختلف حصوں سے لوگ قاضی صاحب کے پاس شکایت لے کر آتے رہے جس پر ایک بھاری جمعیت نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جا کر بریگیڈ کمانڈر سے شکایت کی۔

قاضی صاحب ان کی ترجمانی کر رہے تھے انہوں نے ایک فقرہ کسا جو ایٹمی میزائل سے کم نہ تھا۔ انہوں نے کہا، ''سال 1947 میں جب ان پڑھ قبائلی لشکر نے اس علاقے پر ہلہ بولا تو انھوں نے متمول لوگوں پر ظلم اور لوٹ مار کے پہاڑ توڑے جس کے دوران اسی طرح کا شدید تشدد کیا جو آپ کی فوج کر رہی ہے۔ ہم نہتے لوگ تھے ہم سوائے اس بددعا کے اور کوئی مدافعت نہ کر سکے کہ یا اللہ ان ظالموں کو غرق کر، ہمیں نجات عطا کر، ان لوگوں سے فی الواقع ہمیں نجات مل گئی، ہم یہی ہتھیار آپ کے خلاف بھی استعمال کرتے ہیں۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے انہوں نے قمیص کا دامن آسمان کی طرف پھیلایا جس کی سب نے تقلید کرتے ہوئے آمین کہا۔ بریگیڈیئر نے کہا، بس بابا بس، بددعا نہ دو، سب ٹھیک ہوگا۔ اس کے بعد واضح طور پر فوج کی مداخلت اور تشدد ختم ہو گیا۔ اس واقعے کی وجہ سے قاضی

صاحب تادم مرگ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے اور سب لوگ بلا امتیاز ذات پات ان کو قاضی باوا کہتے تھے۔ باوا فی الواقع وہی شخص کہلانے کا حقدار ہوتا ہے جو لوگوں کا تحفظ اپنی جان کی قیمت پر بھی کر گزرے۔

میرے ساتھ وہ خصوصی شفقت فرماتے تھے چوں کہ میں اس علاقے میں اپنی ننھیال میں رہتا تھا جس کے والدین آزاد کشمیر میں تھے اس لیے میں لوگوں میں نمایاں تھا اور لوگ اپنے بچوں کو میری مثال دے کر پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ قاضی صاحب بھی اس وجہ سے میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں جب بھی، جہاں بھی ان سے ملتا وہ اپنی نشست سے کھڑے ہو کر مجھے ملتے اور بوسہ دیتے ساتھ ہی ساتھ میرے والد صاحب کی ذہانت اور قابلیت کا ذکر کرتے۔ اتفاق ہے کہ ان کی وفات کے کئی سال بعد مجھے ان کے ہی خاندان میں شادی کرنے کا اتفاق ہوا، یہ انہی کی بے پناہ محبت کا پیش خیمہ تھا جو وہ میرے ساتھ روا رکھتے تھے۔ اس زمانے کی ترجیحات کے پیش نظر مجھ جیسے انسان کو جس کا کوئی آگے پیچھے نہ ہو اور نہ اپنا کوئی گھر ٹھکانا ہو کوئی داماد بنانا بخوشی قبول نہ کرتا۔

میرے نانا پیر حسام الدین ایک انتہائی برگزیدہ ہستی تھے۔ انہوں نے تنگ دستی کے باوجود میری تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم وہ گھر پر خود ہی دیتے تھے جبکہ مروجہ تعلیم کے لیے ہر قسم کی سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جو گلستان، بوستان اور شاہ نامہ فردوسی پڑھ لے گا وہ وزیر اعظم بنے گا۔ میں نے اس لالچ میں یہ کتابیں بہت دلچسپی سے پڑھیں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کہا تھا' لیکن میں چار سال کی وکالت کے باوجود کچھ نہ بن سکا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد آدمی کی سمجھ بوجھ اس قابل ہو جاتی ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری سنبھال سکتا ہے۔

میرے ماموں غیاث الدین اور خالائیں میرے ساتھ بے مثال محبت کرتے تھے۔ آٹھویں جماعت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ میرے والدین نہیں ہیں۔ میری سگی نانی تو سال 58-1957 میں ہی وفات پا گئی تھیں تاہم میرے نانا جان کی منکوحہ دوسری بیوی نے مجھے اور باقی لوگوں

کو اتنا ہی پیار دیا جتنا سگی نانی دیتی تھیں۔ ان کا تعلق تحصیل سوپور کے ''بوٹینگوں'' گاؤں سے تھا۔ میری ننھیال کے لوگ وادی کے مختلف حصوں میں رہائش پذیر۔ اس لیے میں نے وادی کے ہر حصے کی خوب سیر کی اور ہر کونے کھدرے کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بالخصوص ضلع بارہ مولہ' کپواڑہ اور سرینگر۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز

مجھے نانا جان نے کنڈی کے پرائمری سکول میں داخل کروایا جہاں اس وقت سرفراز میر' یا راجہ سکندر نامی استاد سکول کے مدرس تھے اور یہ ہائی سکول کنڈی کا ہی حصہ تھا جس کا نام ''شیر کشمیر ہائی سکول کنڈی'' تھا۔ اس کا پرائمری حصہ اس سے ملحقہ ایک دکان نما عمارت میں تھا جس کے اوپر ڈاکخانہ تھا۔ لوگوں میں پڑھنے کا رجحان کم ہی تھا اس لیے بچوں کی تعداد بھی کم تھی۔ مجھے اس وقت کے تقریباً تمام کلاس فیلوز کے نام یاد ہیں۔ میں آزاد کشمیر ہجرت کے بعد جب کبھی بھی واپس اپنی جائے مولود کی طرف گیا، ہر دوست کے گھر گیا اور ہر شخص سے ملا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس زمانے اور اس جگہ کے لوگوں جیسا پیار میں نے کہیں نہیں پایا، ان لوگوں کا پیار خالصتاً تھا جس میں کسی طرح کی کمی نہ تھی۔ میری پرورش ننھیال میں ہوئی اور بچپن کے تعلقات ان لوگوں سے رہے جن کے ساتھ میرا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ لیکن جتنا پیار اور خلوص مجھے ان لوگوں سے ملا اور جتنا اعتماد ہم لوگوں کو ایک دوسرے پر آج بھی ہے اتنا اپنے والدین یا بہن بھائیوں کے درمیان بھی نہیں۔

یہ خلوص اس زمانے کی بات ہے فرازؔ
جب مکان کچے اور لوگ سچے ہوا کرتے تھے

انسان یقیناً ایک سماجی جانور ہے جو ماں باپ یا بہن بھائیوں کے ساتھ ہمہ وقت رہنے کے باعث ہی ان کو اپنا سمجھتا اور مانتا ہے وگرنہ والدین اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ والدین کی ہمدردی، پرورش اور اعتماد اختلاط کی وجہ سے ہوتی ہے، محض رشتہ سے نہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میرے والدین اور بہن بھائی جو اکٹھے پلے بڑھے ہیں، وہ ایک دوسرے پر مجھ سے زیادہ اعتماد کرتے

ہیں۔ گو کہ رشتے نہیں کٹتے لیکن اعتماد اور پیار کا معیار رشتوں سے زیادہ اختلاط پر ہے۔[32]

ہائے کیا لوگ میرے حلقہ احباب میں تھے

دینی تعلیم

پرائمری سکول میں اس عرصہ کے دوران راجہ عبد المجید، راجہ اسماعیل خان اور مولوی اسماعیل خان ہمارے استاد رہے۔ مولوی اسماعیل صاحب نے کچھ عرصہ کے بعد امام مہدی ہونے کا دعویٰ بھی کیا لیکن جب ان کو پذیرائی نہ ملی تو وہ خاموش ہو گئے۔ میرے خیال میں کثیر المطالعہ ہونے کے باعث ان کو یہ گمان ہو گیا تھا کہ وہ امام مہدی ہیں۔ وہ انتہائی قابل استاد اور ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کی علاقہ کے لوگ بڑی قدر کرتے تھے، اس لیے ان کے دعوے کے خلاف شدید ردِ عمل نہیں ہوا۔

اس زمانے کے عام دیہاتی ماحول کے مطابق صبح مسجد شریف میں مولوی صاحب کے پاس قرآن اور فارسی کا درس ہوتا۔ نورانی قاعدہ مکمل ہونے کے بعد تیسویں سپارے سے قرآن مجید کا آغاز کیا جاتا تھا۔ باضابطہ تقریب قرآن کشائی ہوا کرتی تھی، میرے لیے بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلے تو میرے نانا مرحوم مسجد میں درس قرآن دیتے اور بچوں کو پڑھاتے تھے اس کے بعد میرے ماموں اور گاؤں کے سب لڑکے اس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ چھٹی، ساتویں جماعت کے دوران فارسی کی کتابیں شاہنامہ فردوسی، دیوان حافظ، کریما، نام حق، گلستان و بوستان بالخصوص پڑھائی جاتی تھیں۔ اس کے معنی نویں اور دسویں کلاسز میں سمجھائے جاتے تھے۔ الحمد اللہ یہ سب پڑھنے کا موقع ملا جب کہ ان کے مطالب اور معنی اب سمجھ آ رہے ہیں۔

قرآنی آیات

جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو ہمارے گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک مولوی

حبیب الرحمان جو پاکستان ہجرت کر گئے تھے، واپس اپنے گاؤں آئے۔ مولوی صاحب بچپن میں سال 1949-50 میں پاکستان چلے آئے تھے جہاں مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا غلام اللہ کے مدرسے سے پڑھ کر آئے تھے۔ کئی روز اپنے گھر چھپے رہنے کے بعد وہ اس دن نمودار ہوئے جس روز کشمیر کے وزیر اعظم غلام محمد صادق ہمارے علاقے کے دورے پر آئے۔ ان کے گھر والوں نے ان کو ان کے روبرو پیش کر کے کہا کہ ''یہ مولوی ہمارا بیٹا ہے اور پاکستان سے ہم نے اس کو واپس منگوایا ہے۔ اس لیے اس کو یہاں آباد کریں۔'' ہم لوگ سکول کی طرف سے اس جلسے میں تالیاں بجانے کے لیے جمع کیے گئے تھے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر اپنی ہجرت کا وقت خواب کی طرح یاد آیا اور محسوس کیا کہ غالباً ان کے گھر والوں نے پولیس کے ٹارچر سے بچنے کے لیے ان کو سب سے بڑے لیول کے آدمی کے پاس پیش کیا ہے اور فی الواقعہ یہی درست طرزِ عمل تھا وگرنہ ان کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان کی بھی شامت آتی۔ اس کے بعد یہی مولوی صاحب ہمیں مسجد میں قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ سخت گیر انسان تھے۔ قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 21 کے پہلے دو حروف ''یاایھا الناس عبدو۔۔'' اور سورۃ النساء کی آیت نمبر 1 مجھے پڑھنی نہیں آتی تھی۔ جس پر کئی دن لگ گئے اور یہ تمام ایام میری پٹائی ہوتی رہی۔ میں "س عبدو" اور "س تقو" ملا کر نہیں پڑھ پا رہا تھا۔ آج میں جب ان آیات کو پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ کتنی عظیم آیات ہیں جن میں انسان کی تخلیق کی سائنس' حقوق اور مقصد و مدعا بیان کیا گیا ہے جن کو بغیر صحیح العقیدہ اور صحیح العلم ہونے کے آدمی سمجھ نہیں سکتا۔ میرے خیال میں اس آیت میں پنہاں مدعا کی وجہ سے ہی پڑھنے میں بھی مشکل آ رہی تھی اور اب سمجھنے میں۔ ہر دو آیات کا ترجمہ بالترتیب یوں ہے:

''لوگو، عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''

{سورۃ بقرہ آیت نمبر 21} ''اے لوگو ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا ہے اور اس سے اس کا جوڑا پیدا فرمایا اور ان سے کثیر مرد اور عورتیں پھیلا دیئے اور ڈرو اللہ تعالی سے جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے حقوق مانگتے ہو اور ڈرو رحموں کے قطع کرنے سے بے شک اللہ تعالی

تم پر ہر وقت نگران ہے۔''

میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان آیات کو پڑھنے میں مجھے بہت وقت لگا جن کو بعد ازاں سن شعور میں سمجھنے کا موقع ملا اور یہ راز افشا ہوا کہ قرآن صرف پڑھنے کے لیے نہیں سمجھنے، تحقیق کرنے اور عمل کرنے کے لیے ہے، مُردے بخشوانے یا دلہن کو اس کے نیچے سے گزارنے کے لیے نہیں۔

بچپن میں ہمارے گھر گاؤں کی ایک بوڑھی خاتون' جن کو ''بالا بی ماسی'' کہتے تھے، ہر ہفتہ کی رات کو قیام کے لیے آتی تھیں۔ وہ مجھے کہا کرتی تھیں کہ میں تمہاری ماں کی دائی ہوں جو ماں برابر ہوتی ہے، اس لیے تم کو بھی اپنا بچہ سمجھتی ہوں۔ اتوار کی صبح کو کھیتوں کی پگ ڈنڈیوں اور ندی کے کناروں سے جڑی بوٹیاں نکال کر لاتیں مجھے اور باقی بچوں کو پلاتیں۔ یہ کڑوی ترین بوٹیاں ہوا کرتی تھیں جن کا تلخ ذائقہ میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ان کے پینے سے آپ کو زندگی بھر پھوڑے پھنسیاں نہیں نکلیں گے اور پیٹ کی بیماریاں بھی نہ ہوں گی اور ایسا ہی ہوا۔ جڑی بوٹیوں کے نام جان آدم' بارہ گیر' چمچے پتر' پتریس' بتایا کرتی تھیں۔ میں آج بھی ان کو دیکھ کر پہچان اور نکال سکتا ہوں۔ ہمیں ان کے آنے کا بہت انتظار رہا کرتا تھا کیوں کہ رات کو وہ ہمیں کہانیاں بھی سنایا کرتی تھیں' سردیوں کی راتوں میں چرخہ کاتتیں اور گرمیوں میں ہمیں دریا پر لے جاتی تھیں۔ آج کل کے زمانے میں ہمارے بچے یہ بات نہ پسند کرتے ہیں، نہ ہی کسی میں اتنا خلوص ہے کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کے بچوں کے لیے اپنا وقت ضائع کرے۔ ان سماجی تعلقات کی بجائے اب بچوں کو کارٹون اور ویڈیو گیمز جبکہ بڑوں کو ٹی وی ڈراموں اور فلموں کے بے حس سحر نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اور اب فیس بک، میسنجر، ٹوئٹر، واٹس ایپ، اور نہ جانے کیا کیا ہے جس نے باہمی اختلاط ختم کر دیا ہے۔

بچپن کے مشاغل

بچہ فطرتاً ماحول کا محتاج ہوتا ہے اور ماحول ایسا سانچہ ہے جو بچے کی زندگی کو عمل میں ڈھالتا ہے۔ ماحول کی ابتدا ماں، باپ، نانا، نانی، دادا، دادی، چچا، پھوپھی اور خالہ، ماموں سے ہوتی ہے۔

اب یہ رشتے محض لوک کہانیوں میں پائے جاتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کو بچے کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے اور اب آنے والی دنیا کے لوگ رشتوں کے ماحول سے نہیں بلکہ مفادات کے ماحول سے متاثر ہوں گے۔

بہر حال میرا بچپن نانا، نانی کی آغوش میں گزرا ہے جب اپنے بہن، بھائیوں اور کزنز میں فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں سے الگ رہنے کی وجہ سے میرا تعلق اپنے ماموں اور خالہ کے بچے بچیوں کے ساتھ رہا اور اس وقت تک میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ان رشتوں اور حقیقی بہن بھائیوں میں کوئی فرق ہوتا ہے۔ ہندومت میں کزن میرج اسی فلسفہ کے تحت منع ہے۔

ہمارے دیہاتی ماحول میں مال مویشی پالنا اور زمینداری ہر گھرانے کے کلچر اور معیشت کا خاصا تھا۔ چنانچہ میری ننھیال میں بھی ایسا ہی تھا۔ ہمارے گھر میں بھیڑیں، بکریاں اور گائیں ہوا کرتی تھیں۔ میری ابتدائی زندگی میں دسویں جماعت تک بلکہ اس کے بعد کالج کے ابتدائی دنوں میں بھی یہ ذمہ داریاں تھیں کہ صبح سویرے اٹھ کر بھیڑیں اور بکریاں گھر سے نکال کر قریبی پہاڑی چراگاہوں میں جن کو ہم لوگ ''نکہ'' کہتے تھے، چھوڑ کر آنا تھا اور شام کو ان کو اکٹھا کر کے گھر واپس لانا ہوتا تھا۔ بھیڑ بکریاں سنبھالنا بہت مشکل کام ہوتا ہے کیوں کہ وہ ٹک کر کسی ایک جگہ نہیں رہتیں۔ ہری بھری شاخیں ان کے دانتوں کی نذر ہو جاتی ہیں اور مشکل سے مشکل مقام پر جا پہنچتی ہیں۔ بکریاں بالخصوص بے قرار جانور ہوتی ہیں، اس لیے کہا گیا ہے کہ ''غم نہ داری بُز بہ خر''۔ یعنی اگر کوئی غم نہ ہو تو بکری خرید لیں۔ جبکہ بھیڑ طبعی طور ایک مخبوط الحواس، غبی اور کند ذہن جانور ہوتی ہے جس طرف پہلی بھیڑ نکل جائے، باقی ساری اسی کا پیچھا کرتی ہیں اسی لیے ''بھیڑ چال'' کی اصطلاح عام ہے، جو آج کل کے ووٹر ہیں۔ ان جانداروں کی خصوصیات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے مالکان یا گلہ بان کو ان کو سنبھالنے میں کس قدر دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔

اس ماحول میں مجھے اپنے گاؤں کے دیگر بچوں کے ساتھ زندگی کی ابتدا کرنا پڑی اور اسی عادت نے مجھے زندگی بھر متحرک رکھا۔ سال میں دو بار بھیڑوں سے اون اتاری جاتی تھی جو بذات خود

ایک میلے کا سماں ہوا کرتا تھا۔ گھر کے سارے بچے جمع ہو کر ''چوب چراغ''[32] جس کو مقامی زبان میں ''دلی'' کہتے تھے، جلا کر اون اتارنے والے کے لیے روشنی کا بندوبست کرتے اور اس کی خاطر تواضع کی جاتی۔ اسی اون کو پھر ہماری نانی اور خالائیں کاتتیں اور اس سے پٹو کی چادریں اور ٹوپیاں بنائی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں ہمارے گھروں میں نرم و نازک بستروں کی بجائے اونی لوئیوں اور چادروں کا اوڑھنا بچھونا ہوا کرتا تھا۔ یہ چیزیں آہستہ آہستہ لحافوں، بستر، گدوں اور کمبلوں میں بدل گئیں اور اب ان دیہات میں اس زمانے کے بچوں کو لوئیوں یا چادروں جن کو ''پٹوڑا'' کہا جاتا تھا، دیکھنے کا تصور بھی نہیں رہا۔ تہذیب ہمیشہ ارتقا پذیر رہی ہے اور یہ رہن سہن کی عادتیں تہذیب کا حصہ ہیں جن کو بدلتے رہنا ہے۔ اونی پٹو کی شلوار، دھان کے گھاس کے جوتے جن کو ''پولیں'' کہتے تھے، لکڑی کی بنی ہوئی چپل جس کو ''کھڑام'' کہتے تھے، سردیوں کے موسم میں گھر کی عورتیں رات کو چرخہ کاتتیں اور مرد دھان کے خشک تنوں سے جس کو ''پولے'' کہتے تھے، سے چٹایاں بناتے تھے جن کو ''پھوڑی'' یا ''تعجی'' کہتے تھے، یہ سب اس زمانے کی تہذیب کا حصہ ہوتے تھے جو اب خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ سردیوں کی لمبی راتوں میں رسوئی گھر میں یہ ساری مشق چوب چراغ کی روشنی میں ہوا کرتی تھی اور چولہے میں توت، پشیڑ یا چھور کی لکڑی جلتی رہتی تھی۔

موسم سرما کی آمد سے قبل باہم اتفاق سے سب لوگ ہر گھر کے لیے ایندھن جمع کر لیتے تھے۔ میں گاؤں کے دیگر لڑکوں کے ساتھ سکول سے چھٹی والے دن جنگل سے لکڑیاں لینے جاتا۔ اس کے لیے جنگل کے گرے ہوئے درخت کاٹ کر بالن بنا کر لایا جاتا تھا۔ سردیاں چھٹتے اور برف اُٹھتے ہی گاؤں کے لڑکے مل کر جنگل میں گچھیاں (Mushroom) چننے چلے جاتے جو ذاتی استعمال کے ساتھ ساتھ فروخت بھی کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہری گچھیاں لگ بھگ بیس روپے کلو فروخت ہوتی تھیں۔

زمینداری ماحول میں فصل کٹائی کے موسم میں گاؤں بھر میں مشترکہ طور ایک دوسرے کی فصل کاٹتے تھے جس میں مکئی اور چاول کی فصل ہوا کرتی تھی۔ اسی موسم میں اخروٹ کے درختوں سے

اخروٹ بھی اتارے جاتے تھے جس کے لیے گاؤں میں دو آدمی ایسے تھے جو ہمارے درختوں سے ایک لمبا بانس یا بھید کا ڈنڈا لے کر اخروٹ جھاڑتے تھے۔ اس ڈنڈے کو ''چانبا'' کہا جاتا تھا۔ جو ڈالہ اس کی پہنچ سے باہر رہتا اس کو ہم لوگ زمین سے ڈنڈا پھینک کر اتارتے تھے۔ جب گھر کے سارے لوگ گرے ہوئے اخروٹ جمع کر لیتے تھے تو ہم بچہ لوگ بچے کھچے اخروٹ کونوں کھدروں سے تلاش کر کے اپنی ملکیت میں لے لیتے جو اپنی ذاتی آمدن کا باعث بنتے تھے، اس رسم کو ''ٹونڈی'' کہا جاتا تھا۔ ہم لوگ شرارتاً پتوں کے نیچے اخروٹ کو چھپا لیتے اور ٹونڈی کے بہانے ان کو سمیٹ لیتے تھے۔ جیب خرچ بنانے کے لیے ہمارے ہاں عام رواج ہوا کرتا تھا جو کہ اخروٹ اتارنے کے موسم میں صبح سویرے اور بالخصوص جس روز تیز آندھی چلتی تھی، اس روز گرے ہوئے اخروٹ یا اس کی گریاں نکال کر فروخت کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سال میں نے پندرہ ہزار کی گریاں فروخت کی تھیں اور یہ میری ذاتی آمدن کا حصہ تھے۔ ساٹھ کی دہائی میں پندرہ ہزار روپے کا مالک آج کل کے لکھ پتی کے برابر ہوتا تھا۔

گرمیوں کے موسم میں عام لوگوں کی طرح ہمارا گھرانا بھی تین مہینوں کے لیے سرد جگہوں پر چلا جاتا تھا جس کو مقامی زبان میں ''بہک'' یا ''ڈھوک'' کہتے ہیں۔ یہ زندگی یورپی پیپوں، برصغیر کے خانہ بدوشوں یا بکروالوں کی کی طرح ہوتی ہے جس کا خاص مقصد میدانی علاقوں کی گرمی سے بچنا اور مال مویشی کو چراگاہوں میں چھوڑنا ہوتا ہے کیوں کہ میدانی علاقوں میں فصلوں کی وجہ سے چراگائیں محدود ہو جاتی ہیں۔ اس موسم کے دوران دودھ، دہی، لسی، مکھن، گھی وافر ہوتا ہے اور بہکوں میں زندگی سوتے سوتے ہی گزر جاتی ہے۔

سردیوں میں بہت زیادہ برف پڑتی تھی جواب کم بلکہ بہت کم ہوگئی ہے۔ میدانی علاقوں میں تین سے چھے فٹ تک برف بہر حال پڑا کرتی تھی جواب ایک دو فٹ تک آ پہنچی ہے۔ سکول اور کالج کئی کئی دن تک بند رہتے تھے۔ ہمارے علاقے کا رابطہ وادی کے باقی حصوں سے کم و بیش پانچ مہینے تک محدود ہو جاتا تھا جس پر اب دفاعی ضرورتوں کے تحت قابو پا لیا گیا ہے۔ اور نتھ چھنہ گلی جو اس علاقے کو وادی کے ساتھ ملاتی ہے، تقریباً کھلی رکھی جاتی ہے، اکثر اتنی برف پڑا کرتی تھی کہ پانی کے لیے ہمیں

برف پگھلانی پڑتی تھی۔ چھتوں سے برف اتارنا گھر کے ہر فرد کی روزمرہ کی ذمہ داری ہوتی تھی اور ہم لوگ بڑے ذوق وشوق اور جذبے سے ادا کرتے تھے۔ ایک بار میں چھت سے گر کر نیچے برف میں دھنس گیا۔ یہ تقریباً تیس فٹ کی اونچائی تھی لیکن زمین پر موجود اور چھت سے گری ہوئی برف کی وجہ سے فاصلہ کم ہو کر پندرہ فٹ رہ گیا تھا۔ اس کے بعد آج تک مجھے سردیوں کے موسم میں کمر میں بہت درد ہوتا ہے۔ سردیوں کے موسم کے لیے لکڑی، کوئلہ، مٹی کا تیل اور راشن وغیرہ گرمیوں میں ہی اکٹھا کر لیا جاتا تھا۔ سبزیاں زیادہ تر گرمیوں کے موسم میں خشک کر کے رکھی جاتی تھیں جن میں شلجم، آلو، شلجم کے پتے، بینگن، کدو اور دالیں ہوا کرتی تھیں۔ اس موسم میں ہم اخروٹ، شہد، آلو، نمکین چائے اور ستو کا بہت استعمال کرتے تھے۔ اس زمانہ میں کشمیر میں لوگ گرمیوں کے چھے مہینے سردیوں کا سامان جمع کرتے اور سردیوں کے چھے مہینے استعمال کرتے تھے۔ کھانے پینے کی عادتیں سادہ اور مقامی وسائل کے مطابق خورد ونوش میں اس قدر عیاشی نہیں تھی، جتنی آج کل ہے۔ گوشت تو کسی شادی یا ختم نیاز پر یا کسی جانور کے بیمار یا گر کر ناکارہ ہونے پر ہی میسر تھا اور مرغ کا گوشت کسی مذہبی بڑے دن، مہمان کے آنے، اپنے یا مرغوں کے بیمار ہونے کی صورت میں ہی کھانا نصیب ہوتا تھا۔ تب ملاوٹ نہیں تھی کھانے میں۔

سکول کے زمانے میں ہمارے ہاں کھیلوں میں کبڈی، والی بال، فٹ بال، بیڈمنٹن، گلی ڈنڈے اور چیتو کا رواج عام تھا۔ ہاکی اور کرکٹ بھی کھیلوں میں شامل تھے لیکن وسیع میدان نہ ہونے کی وجہ سے یہ بہت کم جگہوں پر کھیل سکتے تھے۔ سکول اور کالج کے زمانے میں تقریری مقابلوں کا رواج عام تھا۔ مجھے چھٹی جماعت سے استاد اس کے لیے تیار کر کے وادی کے باقی سکول کے بچوں کے ساتھ مقابلے کے لیے بھیجتے تھے۔ اس زمانے میں Dramatic Club کا بڑا چرچا ہوا کرتا تھا جس میں مجھے اکثر بیٹی، بیوی یا ماں کا کردار دیا جاتا تھا۔ اس کے لیے مقامی فوج بہت حوصلہ افزائی کرتی تھی اور ڈراموں کو اکثر فوجی سینما ہال میں سٹیج کیا جاتا تھا۔ ڈرامے سٹیج کرانے کے علاوہ ہمارا گروپ قوالیاں اور فلمی گانوں کے لیے بھی مشہور تھا۔ میرے کلاس فیلوز عبدالرشید اور مقبول ہارمونیم بجانے اور گانا گانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہ احباب آج کل ریڈیو کشمیر سرینگر کے پہاڑی پروگرام کے بہترین

فنکار سمجھے جاتے ہیں۔

بچپن میں ہم لوگ ہندوستان اور پاکستان کے فرضی علاقے اور فوجیں بنا کر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے۔ میں پاکستانی فوج کا سربراہ بنتا تھا اور بڑے جذبے سے ہندوستانی فوج سے مقابلہ کرتا تھا۔ زیادہ تر کانوائے پر حملہ کیا جاتا تھا۔ ماچس کی تیلیاں جلا کر گولیوں اور توپوں کا گمان کر کے ایک دوسرے پر حملہ کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ یہ فرضی جنگ کبھی پاکستان نے ہاری ہو۔ اس سے لوگوں کی پاکستان سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ اب اس زمانے کے بچوں کی دلچسپیاں وڈیو گیمز ہوگئی ہیں۔ تاہم فوجی سکول کے بچوں کو مختلف سرگرمیوں میں مصروف کرتے ہیں۔ جن میں آل انڈیا ٹور، فلمی میلے، ہندوستان کے مختلف قومی دنوں پر پروگرامز، ہندوستانی حکومت سدبھاونہ یعنی Good Will سکیم کے تحت بچوں کی برین واشنگ کر رہے ہیں جن کے لیے سکول، ہسپتال اور سینما گھر قائم کیے گئے ہیں۔

میرا بچپن بلاشبہ میری زندگی کا سب سے حسین دور تھا۔ آج بھی مادیت کے اس دور میں پریشان حال ہوتا ہوں تو ماضی کی طرف ایک روزن سا کھل جاتا ہے۔ جس کے پار ندی نالوں اور چراگاہوں میں دنیا و مافیا سے بے خبر اس ننھے سے لڑکے کے چہرے پر پھیلی خوشی جہاں مجھے مسرور کر دیتی ہے وہیں ایک خواہش سی دل میں انگڑائی لیتی ہے کہ کاش وہ دن ایک بار پھر آ جائیں،

؎ میرے بچھڑوں کو مجھ سے ملا دے کوئی
میرا بچپن کسی مول لا دے کوئی
؎ ہاں دکھا دے اے تصور پھر وصبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

سکول، کالج اور شرارتیں

(صبح کی دعا اور پریڈ) میں مدرسہ میں ایک اوسط درجہ کا طالب علم تھا جو صرف غیر نصابی

سرگرمیوں کی وجہ سے زیادہ نمایاں تھا۔ مجھے پڑھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، البتہ سماجی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ پرائمری سطح کی تعلیم کے بعد جب مڈل کلاسز میں چھٹی جماعت میں میرا داخلہ ہوا تو میں اسمبلی میں دعا (Prayer) پڑھاتا اور ڈرل کراتا تھا۔ پریڈ میں زیادہ تر دو نغمے گائے جاتے تھے جو علامہ اقبال کے کلام سے تھے۔ ایک تو ان کی مشہور دعا ہے کہ ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری''۔ دوسرا علامہ اقبال کا مشہور قومی نغمہ تھا، ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا۔''

کچھ مدت بعد ہمارے سکول میں فوجیوں کی خصوصی ٹیم آئی جس نے میری قیادت میں پڑھائی جانے والی Prayer کے گروپ کو ہندوستان کا قومی نغمہ جو ''رابندر ناتھ ٹیگور'' نے لکھا تھا گانا سکھایا اور دلیل یہ دی گئی کہ یہ محض 59 سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا ہے جبکہ علامہ اقبال کی دعا اور نغمہ 4/5 منٹ کا وقت لیتا ہے۔ ہندی نغمہ یوں تھا جو اس وقت بھی ہندوستان کا قومی ترانہ ہے ''جن گھن من ادی نائیک جے ہے بھارت بھاگود داتا۔'' لیکن یہ نغمہ یوم جمہوریہ ہند 26 جنوری اور یوم آزادی ہند 15 اگست کے قومی دنوں تک محدود رکھا گیا۔

26 جنوری کا پس منظر یہ ہے کہ اس روز سال 1950 میں ہندوستان میں آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت ہندوستان کو ''سوشلسٹ سیکولر ڈیموکریٹک ریپبلک'' قرار دیا گیا۔ یہ بھارت کی لیڈرشپ کی فراست کا ثبوت تھا کہ انہوں نے آزادی سے قبل ہی 2 جنوری 1947 کو قرارداد مقاصد پاس کر لی تھی جس میں بھارت کے مستقبل کے آئین کے خدوخال بیان کیے گئے تھے اور آئین ان ہی خطوط پر نافذ کیا گیا۔ صبح کی دعا کے بعد ہیڈ ماسٹر یا کوئی اور استاد کسی موضوع پر تقریر کرتے اور اس دن کی تازہ خبریں سناتے اور ہم سے بھی پوچھتے۔ مقصد سمجھانا اور باخبر کرنا تھا۔

ہائی سکول کے دوران پورا عرصہ میں Prayer گروپ کا نمایاں فرد رہا۔ اس کے علاوہ روزانہ کھیل اور ڈرل پریڈ میں بھی مجھے پریڈ میں کلاس کو لیڈ کرنے کا اعزاز رہا۔ کھیلوں میں دوڑ، والی بال، فٹ بال اور ہائی جمپ میرا محبوب مشغلہ رہا جو ہائی سکول کے گراؤنڈ کے علاوہ سکول سے متصل

کھیتوں میں کھیلتے تھے۔ یہ کھیت ہمارے سکول ٹیچر راجہ اسماعیل خان اور راجہ مجید خان کے تھے جن کا مقامی نام ''کوہلہ'' تھا جو اب مکانیت اور تنگ گلیوں میں بدل گیا ہے۔ ہائی سکول سے کالج کے پہلے دو سال تک میں کرنا ہ ڈرامیٹک کلب کا روح رواں رہا اور مقامی حالات کے حوالے سے بہت سے ڈرامے سٹیج کیے جن میں انعام بھی حاصل کیا۔

سال 1962 میں پورے کشمیر میں پہلی بار آٹھویں جماعت کا امتحان بذریعہ جموں وکشمیر بورڈ لینے کا فیصلہ کیا گیا اور اتفاق ہے کہ میں بھی اسی سال آٹھویں جماعت میں پروموٹ ہوا تھا اور یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ اساتذہ کے تمام تر اندازوں کے برعکس میں نے پہلی ہی کوشش میں یہ امتحان پاس کر لیا جبکہ کلاس کے کئی ہونہار طالبعلم کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس پر میرے ایک استاد نے کہا: **"Examination is realy a chance"**

اور یہ میری حد تک یقیناً درست فقرہ تھا۔

1964 میں مَیں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا جس میں مجھے صرف 211 نمبر ملے جبکہ امتحان پاس کرنے کے لیے 215 نمبر حاصل کرنے ضروری تھے۔ خالو کی بے مہری اور خالہ زاد کی مہربانی سے سکول کے دنوں بالخصوص ساتویں سے دسویں جماعت تک مجھے ایک جذباتی کیفیت سے گزرنا پڑا۔ سکول میں قاضی غلام یحییٰ صاحب جو میرے خالو بھی تھے اور بعد ازاں مجھے ان کا داماد ہونے کا شرف بھی ملا، میری بہت ہی تضحیک کیا کرتے تھے۔ میری نصابی غفلت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ طعنہ زنی کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ ایک بار تو انہوں نے میری ریاضی کی کاپی پر یہ تک لکھ دیا کہ ''میں اپنا اور سکول کا وقت ضائع کر رہا ہوں، زندگی میں کچھ بھی حاصل نہیں کر سکوں گا۔'' مجھ پر زیادہ توجہ دینے اور باقی طلبا کی سطح پر لانے کی بجائے نہ معلوم وہ کیوں میرے درپے تھے۔ ریاضی وہی پڑھاتے تھے اور اس کا پیپر بھی وہی بناتے تھے۔ اس زمانے میں فوٹوسٹیٹ یا سائیکلوسٹائل کی بجائے متعدد کاپیاں کاربن پیپر کے ذریعے بنائی جاتی تھیں۔ ساتویں جماعت کی ریاضی کا، کاربن پیپر میری خالہ زاد جو آج میری بیگم ہیں، نے مجھ تک پہنچا دیا۔ اس کو میں نے صاف پیپر پر ٹریس کر کے تمام سوالات کو سمجھے بغیر حل کروا کر رٹ لیا۔ میرا یہ پرچہ پاس کرنا ان کے لیے اچھنبے کی

بات تھی۔ آٹھویں جماعت میں آنے کے بعد ان کے پاس ہمارا کوئی پیریڈ نہ تھا۔ اور یوں ان سے جان خلاصی ہوگئی، وگرنہ ممکن ہے مجھے سکول چھوڑنا پڑتا۔ ہمارے سکول کے استاد محنتی لیکن بے رحم تھے، بہت مارا کرتے تھے۔ سزا کا طریقہ مرغا بنانا، دوسرے کے کندھے پر چڑھا کر کیاری پیٹھ پر مارنا، ڈنڈے مارنا۔ تھپڑ مارنا عام تھا۔ لیکن بعد میں احساس ہوا کہ یہ سب ہمارے مفاد میں ہوتا تھا۔

بانڈی پورہ

گرمی کی چھٹیوں میں مَیں عموماً بارہ مولہ اور بانڈی پورہ اپنی خالاؤں کے پاس چلا جاتا تھا۔ پڑھنے میں دلچسپی تو نہیں ہوا کرتی تھی لیکن بانڈی پورہ میں میرے نانا جان کے بھائی پیر نجم الدین مرحوم ہائی سکول میں ٹیچر تھے، وہ مجھے سکول ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ میں ان کو ابا جان کہا کرتا تھا۔ سکول ان کے گھر سے تقریباً تین میل کی پیدل مسافت پر تھا۔ ایک دن میں ان کے ساتھ سکول سے واپس آ رہا تھا، غالباً جولائی کا مہینہ تھا اور سورج سوا نیزے پر تھا۔ ادھر سڑک پر مزدور آگ جلا کر تارکول گرم کر کے سڑک پر بچھا رہے تھے۔ مجھے انہوں نے کہا، پتا ہے یہ لوگ کیوں اس دھوپ میں تارکول جلا رہے ہیں؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا، یہ لوگ آپ کی عمر میں پڑھا نہیں کرتے تھے، اس لیے آج یہ کام کر رہے ہیں۔ میں نے اس کو یقیناً سچ سمجھ لیا اور میرے جسم میں کپکپی طاری ہوگی۔ اس ایک بات نے میری زندگی بدل دی۔ اللہ پاک کا فرمان کتنا درست ہے کہ ''اللہ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔'' بہ قول مولانا ظفر علی خان، ''خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی، نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا۔'' میں بکریاں چرانے کے لیے جاتے ہوئے انگریزی Tenses اور Idioms کی کتاب ساتھ رکھتا تھا۔ اس دوران میں نے ہزاروں Tenses اور Idioms مع Spelling زبانی رٹ لیے جو اب عملی زندگی میں کام آتے ہیں۔ واقعات Idioms رٹنے اور میتھ کرنے کے لیے رف کاپی پر پہلے کچی پنسل سے لکھتا تھا۔ اس کے اوپر دوسری بار کالی روشنائی سے اور تیسری بار سرخ روشنائی سے لکھا کرتا تھا۔ اس عمل کو آج کل

غالباً Recycling سے تشبیہ دی جاتی ہے۔اس طرح ہر پڑھی ہوئی بات یاد ہو جاتی تھی۔

مرحوم ابا جان (نانا جان) اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لیے وادی کے مختلف حصوں میں مجھے اکثر ساتھ رکھا کرتے تھے۔ میں زندگی میں پہلی بار ان کے ساتھ جھیل وولر میں اس جگہ گیا جہاں مختلف درختوں کے جھرمٹ کے اندر ایک مسجد ہے جو سطح آب سے تقریباً 6 فٹ اونچی رہتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ اکبر بادشاہ کے زمانہ کی مسجد ہے اور ہمیشہ سطح آب سے 6 فٹ اوپر رہتی ہے خواہ جھیل طغیانی میں ہی کیوں نہ ہو۔اس جھیل کے متصل ایک بڑے پہاڑ کی چوٹی پر بابا شکر الدین نامی ایک بزرگ کی درگاہ ہے جس سے جھیل کے اندر یہ مسجد بالکل نمایاں نظر آتی تھی۔ وولر بیراج جس کی تعمیر پر پاکستان معترض ہے اس جگہ سے تقریباً 4/5 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ یہ جھیل دریائے جہلم کے پانی پر ہے جو میرے خیال میں ہندوستان کے اندر میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ سرینگر کی جھیل ڈل کا پانی بھی جہلم کے ذریعہ اسی میں داخل ہوتا ہے۔ جھیل ڈل چشموں کے پانی سے بنتی ہے جو وہاں ہر جگہ ابلتے ہیں۔

بانڈی پورہ میں میری والدہ کے کزن جاوید اور مشتاق میرے ہم عمر جبکہ مظفر صاحب مجھ سے بڑے تھے۔ ہم لوگ اکٹھے سکول جاتے اور دور دراز پہاڑوں پر سیر اور دریا اور جھیل ڈل میں نہاتے اور مچھلیاں پکڑتے۔ میری والدہ کے ایک کزن ڈاکٹر شریف الدین ختلانی آریو ویدک ڈاکٹر اور بلا کے ماہر نفسیات تھے۔ خود سگریٹ پیتے تھے لیکن گھر میں یا بچوں کے سامنے کبھی نہیں۔ چھٹانک بھر کھانا گھنٹہ بھر میں کھاتے تھے۔ ان کی زندگی میرے لیے ہمیشہ قابل تقلید رہی۔ ان کے بیٹے ارشد بھی میرے ہم عمر اور دوست تھے۔ ارشد کا بیٹا سمیر ختلانی اپنے دادا کی طرح ذہین دہلی میں نامور صحافی ہے جس کے ساتھ میری صرف ایک بار ہی ملاقات ہوئی حالاں کہ اس کا باپ اور ماں میرے بچپن کے بھائی بہن سے زیادہ دوست تھے۔

میٹرک کا امتحان، عبدالغنی حسینی اور رتن لعل

اس زمانہ میں چھٹی جماعت سے انگریزی لازمی پڑھائی جاتی تھی اور فارسی اور عربی میں

سے کوئی ایک اختیاری مضمون لینا پڑتا تھا۔ انگریزی چوں کہ ابتدائی سطح کی تھی، اس لیے اس کو بتدریج پڑھ کر آگے بڑھنا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن آٹھویں جماعت میں سخت کورس تھا جس میں انگریزی زبان میں مضمون نویسی، خطوط، محاورے اور الفاظ کا استعمال مشکل کام تھا یہ اس وقت تو سمجھ نہیں آتا تھا لیکن اب اس کے دریچے کھلتے جا رہے ہیں۔ میں بکریاں چراتے ہوئے انگریزی کے Tenses اور Idioms یاد کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میٹرک میں مجھے تقریباً تین ہزار Idioms یاد تھے۔

جب نویں جماعت میں داخل ہوا تو ایک انتہائی قابل، دیانتدار اور زیرک استاد عبدالغنی حسینی مرحوم ہمارے ہائی سکول میں بطور ہیڈ ماسٹر تعینات ہوئے، انہوں نے انتہائی جانفشانی سے توجہ دے کر مجھے انگریزی پڑھائی اور سمجھائی اگر مجھے ان کی صحبت اور رہنمائی میسر نہ ہوتی تو میں بے شک کبھی میٹرک پاس نہ کر سکتا۔ میٹرک کلاسز میں میتھ، الجبرا اور جیومیٹری کی کتابیں انگریزی زبان میں ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے اور بھی مشکل معاملہ تھا جو مرحوم نے حل کرایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین)۔ ان کے ساتھ سپریم کورٹ آف انڈیا کے ایک فیصلے کی وجہ سے بہت بڑا حادثہ ہوا جس کے تحت حکومت جموں و کشمیر کی اس پالیسی کو امتیازی ہونے کی وجہ سے کالعدم قرار دیا گیا جس کے تحت مسلمانوں کو مقامی سطح پر آگے لانے کے لیے خصوصی کوٹہ کے ذریعہ تقرری اور ترقی میں ترجیح دی جاتی تھی۔ اس کے نتیجہ میں مرحوم دس سال کی ہیڈ ماسٹری کے بعد تنزلی کا شکار ہو کر ٹیچر بنائے گئے جس کے خلاف احتجاجاً وہ مستعفی ہو گئے۔

کشمیر کی خصوصی حیثیت کی وجہ سے ہندوستانی آئین میں اس کو خصوصی مقام ہے جس کی امتیازی قوانین میں بھی گنجائش ہے لیکن جس قانون کے تحت ایسا کیا گیا تھا اس میں ریاست کے باشندوں کے اندر اس امتیاز کو کالعدم قرار دیا گیا جس بنا پر کشمیری پنڈتوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستانی آئین، شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے امتیازی قانون سازی کی اجازت دیتا ہے جس کا فائدہ ہندو اٹھاتے ہیں اور مسلمانوں میں سے گجر، بکروال اور چند علاقے مثلاً لداخ، کارگل، گریس وغیرہ، اسی وجہ سے ان کی اکثریت ہندوستان نواز سمجھی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ ہی ایک پنڈت ٹیچر رتن لعل بھی تھے جو ہمیں میتھ سکھاتے تھے۔ وہ بہت ذہین اور محنتی تھے اور اتفاق کی بات ہے کہ دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ کشمیری زبان بولنے کی وجہ سے میرے ان کے ساتھ مشفقانہ تعلقات تھے۔ ان کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ میں نے میٹرک پاس کیا، وگرنہ ریاضی میں پاس ہونا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جیومیٹری اور الجبرا تو میں کسی طور کر لیتا تھا، البتہ ریاضی کبھی میرے پلے بالکل نہیں پڑا۔ میتھ کی کتاب میں ہر مشق سے پہلے حل شدہ سوالات کی مثالیں ہوا کرتی تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے چند ایک مشقوں کے حل شدہ سوالات کو زبانی رٹ لیا تھا جن میں سے تین سوالات من وعن میٹرک کے سالانہ امتحان میں آ گئے۔ میں نے ان کو آرام سے حل کر دیا اور اس طرح میرا ریاضی کا مسئلہ حل ہو گیا۔

رتن لعل آج بھی زندہ ہیں اور کشمیری پنڈتوں کا واحد گھر ہے جس نے 1990 کی شورش میں اپنا گاؤں نہیں چھوڑا۔ میری 2010ء میں ان سے ملاقات ہوئی اور بہت شفقت سے پیش آئے۔ بہت خوشی کا اظہار کیا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ملی ٹینسی کے دوران انہوں نے یہاں کیسے گزارا کیا تو جواب ملا کہ ''رات کو پاکستانی دہشت گردوں اور دن کو ہندوستانی دہشت گردوں (یعنی فوج) کی غلامی میں''۔ ان استادوں نے ہم میں پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ گو کہ تیسری چوتھی جماعت سے ہی گھر اور مسجد میں قرآن اور فارسی کی کریما، نام حق، گلستان، بوستان، شاہ نامہ فردوسی پڑھائے جاتے تھے۔ کالج کے دوران ہم نسیم حجازی کے ناول، ریڈر ڈائجسٹ، انگریزی رسالے اور اخبارات باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ کلام اقبال پڑھنا ہمارا جنون تھا۔ اقبال کے اشعار زندگی کا پتا دیتے ہیں۔ بہ قول شکیل بدایونی:

کھل جائیں شکیل اس پر اسرارِ خداوندی
اقبال کے شعروں کو انسان اگر سمجھے

میں دیکھتا ہوں کہ آج کے نوجوانوں اور بچوں میں نصابی کتب سے ہٹ کر مطالعے کا رجحان بہت کم ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ محض چند سوالات رٹ کر امتحان پاس کر لینے کو تعلیم کا نام دے دیا گیا ہے۔ مطالعے اور کتاب سے یہ دوری ٹی وی، موبائل، کمپیوٹر

اور انٹرنیٹ جیسی اختراعات کی بدولت ہے۔ مطالعے سے یہ دوری بہت سی خرابیوں کا باعث بن رہی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ادب، تاریخ، زبان اور اخلاقیات کو بھی سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا حصہ ہونا چاہیے۔ آج ہماری نئی نسل جن گوناگوں مسائل کا شکار ہے، وہ اسلاف سے لاعلمی کے باعث ہی ہے۔ ذہانت چاہے کتنی ہی ترقی کر جائے اخلاق کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

موئے مقدس کا واقعہ

27 دسمبر سال 1963 میں حضرت بل سرینگر سے موئے مبارک (رسول اللہ ﷺ کی ڈاڑھی کا بال) چرایا گیا یا کسی طریقہ سے غائب کروا دیا گیا۔ اس وقت میں میٹرک میں تھا۔ سارے کشمیر میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ برف باری اور شدید سردی کے باوجود لوگ لاکھوں کی تعداد میں احتجاجاً سڑک پر نکل آئے۔ دن اور رات میں فرق ختم ہو گیا۔ حکومت بے بس اور حکومتی ادارے مفلوج ہو گئے۔ سکولوں اور کالجوں میں چھٹیاں کر دی گئیں جب کہ طلبہ اس تحریک کا حصہ بن گئے۔

اس دوران ہمارے سکول کے ایک سکھ استاد سردار اندر سنگھ نے غالباً معاملے کی سنگینی کو سمجھے بغیر از راہ مذاق کہہ دیا کہ آپ مسلمان صرف ایک بال کے گم ہونے کی وجہ سے اس قدر پریشان ہیں۔ مجھ سے جتنے بال چاہیے، لے سکتے ہو۔ یہ بات اس نے اساتذہ کے کمرے میں کہی لیکن کسی طور باہر نکل آئی۔ وہ جمعے کا دن تھا جس دن ہمارے سکول میں **Recess** کا پریڈ لمبا ہوا کرتا تھا۔ جب ہم لوگ جمعے کی نماز پڑھ کر واپس آئے تو میرے ایک کلاس فیلو عبدالمجید نے مجھے یہ بات بتائی۔ میں نے سکول کی گھنٹی خود بجائی جس پر سب لڑکے جمع ہو گئے۔

میں نے حکومت اور اس سکھ استاد کے خلاف مذمت کر کے جمع شدہ طلبا کو اس سے انتقام لینے پہ اکسایا۔ لوگ بہت جذبات میں آ گئے اور ٹیچرز روم پر ہلہ بولنے والے ہی تھے کہ ہمارے ہیڈ ماسٹر مرحوم عبدالغنی حسینی بھی نماز سے واپس آ گئے۔ جب ان کو ساری بات کا علم ہوا تو انہوں نے بھی حکمت عملی کے طور پر ہمارے جذبات کی قدر کی اور بظاہر ہمارے ساتھ ہو گئے جس پر ہماری بڑی حوصلہ افزائی

ہوئی۔ تاہم جب ان کو یقین ہو گیا کہ لڑکے ان کے قابو میں آ گئے ہیں تو انہوں نے مجھے جس کے کہنے پر طلبا مشتعل ہوئے اور سرور نامی ایک لڑکے کو کھڑا ہونے کو کہا۔ ہم لوگ کھڑے ہو گئے اور حسینی صاحب نے ایک چابک لے کر ہماری پٹائی شروع کر دی کہ ہم نے سکول کے نظم وضبط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے استاد کی توہین کی ہے، جو اس بات سے زیادہ قابل گرفت ہے جو اس سکھ استاد نے کی تھی۔ ساتھ ہی اس استاد کو ٹیچرز روم میں اساتذہ اور ہمارے سامنے تنبیہ کی اور رخصت پر بھیج دیا۔ یوں اعلیٰ انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے اس سنگین معاملہ کو رفع دفع کر دیا۔ وگرنہ شدید ہندو مسلم فسادات ہونے کا اندیشہ تھا۔ دوسری طرف پوری وادی میں ہندو اور سکھ اس سنگین واقعے میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے تھے اسی شام حسینی صاحب ہمارے گھر تشریف لائے اور میرے نانا صاحب سے میری شکایت کی اس پر انہوں نے بھی میری سرزنش کی لیکن یہ بات کہہ کر حوصلہ افزائی بھی کی کہ رسول اللہ ﷺ کی توہین کسی غیرت مند مسلمان کو برداشت نہیں کرنی چاہیے، تاہم اس کا جواب حوصلے اور جذبات کو قابو میں رکھ کر دیا جا سکتا ہے، فساد سے نہیں۔ انہوں نے میرے مرحوم نانا جان کو کہا کہ اس لڑکے نے غیر معمولی آدمی بننا ہے۔ (نامعلوم کیسے؟) موئے مقدس معجزانہ طریقے سے 3 فروری 1964 کو برآمد کیا گیا جس کے اصل ہونے کی تصدیق اس زمانے کے ایک ولی اللہ سید میرک شاہ مرحوم نے کی۔

بڑی محفلوں میں شرکت

ہمارے علاقے میں تحصیل کی سطح کے تمام کے تمام بڑے عہدے دار اور چند اساتذہ بھی' غیر مقامی اور کشمیری زبان بولنے والے ہوا کرتے تھے جبکہ یہ علاقہ غیر کشمیری زبان بولنے والوں کا تھا۔ ادھر صرف ہمارے چند گھر کشمیری زبان بولنے والوں کے تھے۔ اس لیے علاقے کے اور اس کا دورہ کرنے والے تمام کشمیری بولنے والے آفیسرز کا ہمارے گھر کے ساتھ تال میل رہتا تھا اور شاید ہی کوئی ایسا کشمیری بولنے والا شخص یا افسر ہو جو بلا ناغہ میرے نانا جان کے پاس نہ آتا۔ چوں کہ وہ عربی اور فارسی کے عالم اور استاد بھی تھے اس لیے ان کے پاس بڑی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ مجھے ان مجالس میں

بیٹھنے اور ان کو سننے کا موقع ملتا تھا۔ ان لوگوں میں ہندو مسلمان سارے لوگ 32 ہوا کرتے تھے اور بلا تفریق ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا کرتے تھے۔ تاہم اس بات کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا کہ کھانے میں بڑا گوشت نہ ہو، یوں بھی کشمیر میں لوگ بڑا گوشت کم ہی کھاتے تھے کیوں کہ ایک تو گائے کے ذبح کرنے پر پابندی تھی جو تعزیری جرم تھا۔ دوسرا یہاں کے لوگوں کی اکثریت ہندوؤں سے مسلمان ہوئی تھی جنہوں نے یہ رسم قائم رکھی تھی، ان کے احترام میں لوگ گائے کشی نہیں کرتے تھے۔ تاہم چوری چھپے ایسا ہوا کرتا تھا۔ سال 1989 کی تحریک کے بعد تعزیرات ہند میں اس جرم کے قابل دست اندازی پولیس ہونے کے باوجود اس پر کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ رائے عامہ سب سے بڑا قانون ہے، اسی لیے قوانین کے مآخذ میں سے رسم و رواج کو تقدم حاصل ہے۔ مودی سرکار کے بننے کے بعد پورے ہندوستان میں گاؤکشی پر پابندی لگ گئی ہے لیکن کشمیر میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

بڑے گوشت کے سلسلہ میں پروفیسر عبدالغنی بٹ، حریت کانفرنس کے لیڈر کے ساتھ میرا ایک لطیفہ ہوا۔ جب میں 2005 میں سرینگر گیا تو انہوں نے مجھے کھانے کی دعوت دی۔ میں نے کہا تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر انہوں نے کہا تمہاری دعوت مہنگی نہیں ہو سکتی۔ تم بڑا گوشت کھانے والے کھر پٹھان ہو اور'' تم لوگوں کی مہربانی کی وجہ سے اب یہ کشمیر میں ارزاں ہو گیا ہے۔''میں نے جواب دیا پروفیسر صاحب یہ مسلمانوں پر ہمیشہ حلال رہا ہے لیکن آپ لوگ چوں کہ نومسلم ہیں، اس لیے آپ کو اس حلال چیز کو ہضم کرنے میں وقت لگے گا۔

سکول بلڈنگ

جب ہم لوگ شیر کشمیر ہائی سکول کنڈی میں ساتوں جماعت میں زیر تعلیم تھے، اس وقت ناگہانی طور پر ہمارا سکول جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس وقت اس پورے علاقے میں صرف ایک ہی ہائی سکول تھا اور پوری تحصیل کے طول وعرض سے چھٹی جماعت سے دسویں تک کی تعلیم یہیں ہوا کرتی تھی۔ صرف ٹیٹوال میں ایک مڈل سکول تھا۔ ان علاقوں پر حکومت کی توجہ بھی کم ہی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے

ہندو ہیڈ ماسٹر جن کا نام غالباً ''نرنجن ناتھ'' تھا، نے اپنی مدد آپ کے تحت سکول کی تعمیر کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے سکول سے ملحق ایک پتھریلے نالے اور اس کو گھیرے ہوئے پہاڑوں سے پتھر نکلوا کر جمع کروائے۔ جب بہار کا موسم آیا تو ضلعی اور ریاستی سطح کے حکام اس علاقے کے دورے پر آئے جنہوں نے سکول کی حالت اور طلبا اور اساتذہ کا جذبہ دیکھ کر فوری طور پر سکول کی تعمیر کا بندوبست کر دیا۔ آج کل وہاں پر کئی سکول اور کالج ہیں۔ عبدالغنی لون مرحوم، جب 1973 میں کشمیر میں تعلیم اور صحت کے وزیر تھے، نے اس علاقے کے لیے میرے مطالبہ پر جہاں پر دس بچے میسر ہوں، وہاں پر ایک ٹیچر فراہم کرنے کا حکم دینے کے علاوہ میڈیکل اور انجینئرنگ کالج میں اس تحصیل کے دو بچوں کے لیے سیٹیں مختص کر دیں۔ آج کل وہ علاقہ ہندوستانی آئین کے تحت پسماندہ علاقہ قرار دیئے جانے کی وجہ سے وادی کے کسی بھی مہذب اور ترقی یافتہ علاقے سے کم نہیں اور اس وقت وہاں سے تعلق رکھنے والے کم از کم دو سو کے قریب مرد و خواتین ڈاکٹرز ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسرز اور انجینئرز کا حساب ہی نہیں جو ہندوستانی سطح پر مقابلہ میں شرکت کر کے نمایاں مقام حاصل کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ہندوستان کی اعلیٰ سول سروس میں اس علاقے کا ایک امیدوار پہلی چند پوزیشنز میں سے ایک پر کامیاب ہوا۔

ریڈیو

یہ ان دنوں کی بات ہے جب چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں میں بڑی بڑی خوشیاں پوشیدہ ہوا کرتی تھیں۔ ٹیلی ویژن تو اس دور میں اس دور دراز علاقے میں کیا ہوتا، ریڈیو بھی شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا تھا۔ 1964 سے قبل ہمارے علاقے میں صرف ایک ٹرانزسٹر ریڈیو تھا جو میرے نانا جان مرحوم سال 1962 میں حج سے واپسی پر ساتھ لائے تھے جس کو ''فلپس آٹھ بینڈ'' کہتے تھے۔ دو یا تین گھروں میں جیپ کی بیٹری پر چلنے والے بڑے بڑے ریڈیو تھے۔ ہمارے گھر کے ساتھ ایک مسجد تھی فجر کی نماز کے بعد نمازی اکثر ہمارے گھر آ کر سات بجے یا ساڑھے سات بجے کی پاکستانی خبریں سنا کرتے تھے۔ گاؤں والوں کا ہجوم ہو جایا کرتا تھا۔ جس سے پہلے پہل میں بہت خوش ہوا کرتا تھا کیوں کہ نئی نئی چیز ہجوم

میں رکھ کر سب ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے لیکن جب یہ ہجوم بڑھتا گیا تو میں نے ایک دن اس ٹرانزسٹر میں ایک پرانا سیل ڈال دیا جس سے اس کی طاقت کم ہو گئی۔ غالباً اس میں چار سیل پڑتے تھے جب دو دنوں تک لوگوں کو خبریں نہ سنائی دیں تو میں نے ان کو کہا کہ ہندوستان نے خبریں سننے پر پابندی لگا دی ہے جس وجہ سے ریڈیو نہیں چلتا۔ اس طرح میں نے اس ہجوم اور ان کی میزبانی سے جان چھڑائی۔

تھرڈ ڈویژن

میری دسویں کی جماعت میں 21 لڑکے تھے۔ میٹرک کے امتحان سے قبل ایک ٹیسٹ ہوا کرتا تھا جس کو Detention Test کہا کرتے تھے۔ جو اس ٹیسٹ میں پاس ہوتا، صرف اسی کو میٹرک کے بورڈ کے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت ملتی تھی۔ ہماری کلاس میں سے صرف 18 لڑکوں نے سال 1964 میں یہ ٹیسٹ پاس کیا اور ہیڈ ماسٹر عبدالغنی حسینی مرحوم نے صرف ان ہی اٹھارہ لڑکوں کو امتحان میں شامل ہونے کی اجازت دی۔ مرحوم کی دوربین نظروں نے ان اٹھارہ لڑکوں کی بھی درجہ بندی کر دی تھی۔ جن کی جنرل نالج کی کاپی پر انہوں نے ''اے'' لکھا تھا، اس کا مطلب فرسٹ ڈویژن، جن پر ''بی'' لکھا اس کا مطلب سیکنڈ ڈویژن اور جن پر ''سی'' لکھا تھا اس کا مطلب تھرڈ ڈویژن تھا۔ اسی ترتیب سے سب لوگوں نے امتحان بھی پاس کیا۔ تھرڈ ڈویژن میں سب سے آخر پر میں تھا۔ ہمارے اس بیچ میں سے سوائے ایک دوست، جن کا نام علی زمان ہے اور ٹیٹوال کے رہنے والے ہیں، سب کے سب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نمایاں خدمات انجام دیں۔ علی زمان اس جماعت کا سب سے لائق، ہونہار طالبعلم اور میرے خیال میں کلاس میں بھی اوّل نمبر پر آیا تھا جبکہ اس کی ڈویژن یقیناً فرسٹ تھی۔ حالات نے اس کا ساتھ نہیں دیا، وگرنہ نامعلوم وہ علمی میدان میں کیا انقلاب برپا کرتا۔ اس کو اس زمانے میں نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا بھر کی تاریخی معلومات ہوا کرتی تھیں۔ انگریزی اور حساب کا تو وہ ماہر تھا۔ میں اپنے گزشتہ دورہ سرینگر کے دوران اس کو اس حالت میں دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا۔

لیکن کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی